حکیم مومن خاں مومن

پروفیسر ابن کنول

مومنؔ کی ولادت دہلی میں اس وقت ہوئی جب عظیم مغل سلطنت کا ایک نابینا وظیفہ خوار شاہ عالم شہنشاہ کہلاتا تھا، جس کے وقت میں پہلے مرہٹوں نے قلعہ پر قبضہ کیا، پھر غلام قادر روہیلہ نے تباہی مچائی اور بادشاہ کی آنکھیں نکلوا کر بے نور کر دیا۔ آخر میں انگریزوں کا قبضہ ہوا، یعنی بادشاہت ختم ہو چکی تھی، نام نہاد بادشاہ انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا۔ دلّی بار بار لُٹ کر برباد ہو چکی تھی، صدیوں سے چلی آ رہی تہذیب آخری سانسیں لے رہی تھی، لیکن اس مٹتی ہوئی تہذیب میں اردو کے چراغ کی روشنی تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اٹھارہویں صدی کا اواخر مغلیہ سلطنت کے لئے عہد تاریک تھا تو اردو شاعری کے لئے عہد زرّیں۔ مومنؔ اسی تباہ حال دہلی کے کوچہ چیلان میں ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ مومنؔ کے دادا حکیم نامدار خاں کشمیر سے شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آ کر آباد ہوئے۔ حکمت ان کا خاندانی پیشہ تھا، دربار سے وابستگی ہو گئی۔ نارنول کی جاگیر بھی ملی۔ مومنؔ کے والد غلام نبی خاں حکیم تھے۔ شاہ جہان آباد دہلی کے کوچہ چیلان میں رہائش تھی۔ فرحت اللہ بیگ کے مطابق حکیم آغا جان کے چھتّہ کے سامنے ان کا مکان تھا۔ شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ بھی قریب ہی تھا۔ مومنؔ کے

والد شاہ صاحب سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ مومن نے عربی کی تعلیم اسی مدرسے میں حاصل کی۔ دہلی میں اس وقت مذہبی اور عربی تعلیم کے لئے اس مدرسے کی کافی اہمیت تھی۔ شاہ عبدالقادر جیسے جیّد عالم بھی یہاں درس دیتے تھے۔ مومن کافی ذہین طالب علم تھے، حافظہ قوی تھا۔ عربی و فارسی کے بعد انھوں نے باقاعدہ طب کی تعلیم حاصل کی اور مطب میں نسخہ نویسی کی خدمات انجام دیں۔ مومن کو علم نجوم میں بھی کمال حاصل تھا۔ شطرنج اور موسیقی کا بھی شوق تھا۔ اگرچہ مومن کا تعلق اور قرابت داری حکما اور علما کے خاندان سے تھی۔ ان کی شادی بھی دہلی کے معروف خاندان میں ہوئی تھی۔ خواجہ میر درد کے نواسے خواجہ محمد نصیر ان کے خسر تھے، لیکن مومن کا طرز زندگی مختلف تھا۔ شطرنج، موسیقی، نجوم اور رمل کے شوقین تھے۔ کشمیری ہونے کے سبب خوبصورت اور حسین تھے، ساتھ ہی بنے سنورے بھی رہتے تھے۔ خوش لباسی اور خوش مذاقی ان کی شخصیت کا وصف تھا۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے ''دہلی کا آخری یادگار مشاعرہ'' میں جو ان کی تصویر کشی کی ہے اُسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بگڑا ہوا شاہزادہ ہو۔ کاندھوں پر پڑے ہوئے گھونگھرالے لمبے بال، مِسّی آلودہ دانت، شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا، سرخ گلبدن کا پاجامہ، باریک لیس لگی ہوئی دوپلڑی ٹوپی، غرضیکہ بڑی آن بان کے ساتھ محفل میں آتے تھے۔ مومنؔ کی یہ رنگین مزاجی اور خوش لباسی ان کی عاشق مزاجی کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ ان کے معاشقوں کا ذکر ان کی شاعری ہی میں مل جاتا ہے۔ نوجوانی میں کیے گئے ان کے معاشقوں کی بات سبھی نے کی ہے۔ پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے مومن کے پانچ معاشقوں کی تفصیل بیان کی ہے۔ مولوی کریم الدین طبقات شعرائے ہند میں لکھتے ہیں:

> ''بہت خلیق اور حلیم ظریف آدمی ہے، ابتدا میں تمام اوقات شعر گوئی اور لہو ولعب دنیا میں صرف کر کے تمام مزے عیاشی کے

اٹھا کر اب توبہ کی بلکہ شعر کہنا بھی چھوڑ دیا ہے، مجھ پر کمال عنایت فرماتے ہیں، اکثر شام کو شہر کی سیر کرتے ہیں۔ پابند نماز روزہ کے بھی بہ نسبت سابق بہت ہیں۔'' (طبقات الشعرائے ہند، ص ۵۸، بحوالہ ریختہ)

مومنؔ نے زیادہ طویل عمر نہیں پائی۔ ۱۸۵۲ء میں چھت سے گر کر ان کا انتقال ہو گیا۔ مختصر زندگی میں مومن نے زندگی کا بھرپور لطف اٹھایا۔ عمر کی تقریباً تین دہائیاں عیش و نشاط میں گزار دیں اور جب سب کچھ چھوڑ کر زہد و تقویٰ اختیار کیا تب بھی زاہد خشک کی طرح زندگی کو نہیں جیا، طبیعت کی خوش اخلاقی، خوش مذاقی اور ظرافت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ مومن نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ دراز نہیں کیا، کسی کی ملازمت قبول نہیں کی۔ اگر قصائد بھی کہے تو کچھ حاصل کرنے کے لئے نہیں، محض رشتوں میں پختگی لانے کے لئے۔ کسی کے ماتحت رہ کر زندگی گزارنا ان کے مزاج میں شامل ہی نہیں تھا، شاید یہی وجہ ہے کہ بہت دن تک شاہ نصیر سے کلام کی اصلاح بھی نہیں لی۔ ابتدا میں انھیں کلام دکھایا، پھر استاد کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ طبیعت کی یہ نازک مزاجی ان کی شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔

مومنؔ کا کلیات ان کی زندگی میں ہی زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ کلیات کی ابتدا قصائد سے ہوتی ہے۔ اس میں نو قصیدے شامل ہیں، جن میں دو قصیدے دنیاوی شخصیات یعنی وزیر الدولہ امیر الملک نواب محمد وزیر خاں نصرت جنگ والیٔ ریاست ٹونک اور مہاراجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ کی مدح میں کہے ہیں، لیکن دونوں سے کچھ حاصل کرنے کے لئے نہیں۔ دیگر قصائد میں ایک قصیدہ حمدیہ اور دوسرا نعتیہ ہے۔ ان کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت امام حسنؓ کی شان میں قصیدے کہے گئے ہیں۔ یہ قصائد اس بات کا ثبوت ہیں کہ مومنؔ انتہائی نازک مزاج اور خوددار تھے، وہ کسی کے روبرو دست طلب دراز

نہیں کرتے تھے، بلکہ صرف خدا کی رحمت پر یقین رکھتے ہیں:

اللہ مرے گناہ بے حد وہ ہیں کہ شمار کو تھکایا
مومنؔ کہے کس سے حال آخر ہے کون ترے سوا خدایا

کلیات مومنؔ میں دوسو اٹھارہ غزلیں اور کچھ متفرق اشعار شامل ہیں، ساتھ ہی کچھ قطعات، رباعیات اور مثنویات موجود ہیں۔ بیشتر مثنویوں میں ان کے معاشقوں کا ذکر ہے اور کچھ میں حمد، نعت، مناجات اور جہاد کو موضوع بنایا گیا ہے۔

جس طرح مومنؔ نے عام روش سے ہٹ کر اپنی طبیعت کے مطابق آزادانہ زندگی گزاری، شاعری میں بھی ایک الگ راہ اختیار کی۔ ان کا کلام ان کے حقیقی جذبات و احساسات کا عکاس ہے۔ وہ اپنے دل کے ترجمان ہیں، جو دل پر گزرتی ہے وہ رقم کرتے ہیں، بلاوجہ فلسفیانہ خیالات اور مسائل تصوف میں نہیں اُلجھتے۔ شاعری کو داخلی جذبات کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ بغیر جھجک کے بیان کر دیتے ہیں۔ مومن نے غزل کو غزل کے لغوی معنی کے طور پر استعمال کیا۔ ان کا عشق حقیقی نہیں، مجازی ہے، وہ عشق کرتے ہیں تو ببانگ دہل اس کا اعلان کرتے ہیں، کسی خوف سے اشارے اور کنایوں میں بات نہیں کرتے۔ ان کی عشقیہ مثنویاں اس کا ثبوت ہیں۔ ولی کی طرح مومن کا محبوب اسی زمین کا باشندہ ہے۔ مومنؔ کے یہاں عشق کے بیان میں جو بیباکی ہے وہ شاید ہی کسی اور کے یہاں نظر آئے۔ وہ اپنی رندی و شاہد بازی پر نہ شرمندہ ہوتے ہیں نہ اسے پوشیدہ رکھتے ہیں، برملا اس کا اظہار کرتے ہیں:

وصل کی شب شام سے میں سو گیا
جاگنا ہجراں کا بلا گیا

تھی وصل میں بھی فکر جدائی تمام شب

وہ آئے تو بھی نیند نہ آئی تمام شب

قہر ہے، موت ہے، قضا ہے عشق
سچ تو یوں ہے بری بلا ہے عشق

وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے
خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

اُس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے آواز تو دیکھو

پردے کی کچھ حد بھی ہے پردہ نشیں
کھل کے مل بس منہ چھپانا چھوڑ دے

وہ نوجوان عابد و زاہد کہ سب جسے　　کہتے تھے مومن اور بہت دیندار تھا
کل ایسے حال سے نظر آیا کہ کیا کہوں　　جو تھا سو اُس کو دیکھ کے زار و نزار تھا

اردو شاعری میں مومنؔ کو جو مقام حاصل ہوا ہے وہ ان کی غزل گوئی کی وجہ سے ہے۔ ان کی غزل، غزل گوئی کے فن کا حق ادا کرتی ہے۔ عبادت بریلوی مومنؔ کی غزل گوئی کے متعلق لکھتے ہیں:

''مومنؔ کی غزل اُن کی شخصیت کی صحیح آئینہ دار ہے، ان کا مخصوص مزاج اس میں پوری طرح بے نقاب نظر آتا ہے۔ وہ

حسن کے شیدائی تھے، انھوں نے اپنے آپ کو صورت پرست کہا ہے، اُن پر ساری زندگی ایک سرخوشی کی سی کیفیت طاری رہی۔ عشق کی لغزشِ مستانہ ہی کو انھوں نے زندگی سمجھا اور اسی عالم میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اُن کی غزل میں شخصیت کے یہی رنگ رچے ہوئے ہیں۔ اُن کی مخصوص جذباتی اور ذہنی کیفیت کا عکس ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔'' (مومن اور مطالعہ مومن از عبادت بریلوی، اردو دنیا، لاہور، ۱۹۶۱ء، ص ۳۲۴)

مومنؔ اپنی زندگی ہی میں اپنی طرز زندگی اور غزل گوئی کی وجہ سے کافی مقبول تھے، وہ کبھی بھی کوئی متنازع شخصیت نہیں رہے۔ انھوں نے آزادانہ زندگی گزاری، ان کی کسی سے معاصرانہ چشمک نہیں تھی، سب ہی ان کی شاعری اور انھیں پسند کرتے تھے۔ غالبؔ جیسا تنک مزاج شاعر مومن کے ایک شعر کے بدلے اپنا پورا دیوان دینے کو تیار ہو گیا تھا۔ غالبؔ کی یہ بات مومن کی شاعری کے معیار کو متعین کرتی ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری مومن کی غزل گوئی پر اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مومنؔ کی غزل کو جس تخلیقی قوت نے ادبی تاریخ میں تحفظ فراہم کیا ہے وہ ان کی غزل کا کلاسیکی کمال ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ان کی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کا استعمال ہوا ہے۔ اس مقام پر وہ عشق، جذبے، احساس اور تخیل کی ارتفاعی سطح پر نظر آتے ہیں۔ یہاں سارے تجربے مل کر ایک ایسی معنوی وحدت کو تشکیل دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جہاں شاعر کی تخلیقی توانائی نقطۂ کمال تک جا پہنچتی ہے۔ یہ وہ شاعری ہے جہاں ان کا چیستانی اسلوب دب جاتا ہے اور ابلاغ کا عمل تیز اور روشن

ہو جاتا ہے۔ اس شاعری میں نہ شعری اشکال ہیں نہ چیستان ہیں، یہاں محض انسانی جذبوں کی زبان بولتی ہے۔'' (اردو ادب کی تاریخ از تبسم کاشمیری، ایم آر پبلی کیشنز دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۷۷۸)

یہ بات سچ ہے کہ مومنؔ کی شاعری میں پیچیدگی نہیں ہے۔ جذبوں کے اظہار کے بیان کے سبب مومن کی شاعری آورد نہیں آمد کی شاعری معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہر طرح کے جذبے کو بڑی سادگی سے بیان کر دیتے ہیں، جو دل پر ایک اثر چھوڑ جاتا ہے:

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

دل لگانے کے تو اُٹھائے مزے
جی بلا سے رہا، رہا نہ رہا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اتنا تو نہ گھبراؤ راحت یہیں فرماؤ
گھر میں مرے رہ جاؤ، آج آئے ہو کل جانا

میں بھی کچھ خوش نہ تھا وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

مئے نہ اُتری گلے سے جو اُس بن
مجھ کو لوگوں نے پارسا جانا

کلام میں سادگی یا سلاست اسی وقت آتی ہے جب دِلی جذبات کا اظہار جوں کا توں ہوتا ہے، بصورتِ دیگر بیان میں تصنع پیدا ہو جاتا ہے۔ جو نثر میں نو طرز مرصع اور فسانۂ عجائب میں نظر آتا ہے۔ مومنؔ نے شاعری کو اپنے احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور وہ اس اظہار میں پیچیدگی لا کر بیان کو مبہم یا چیستاں نہیں بنانا چاہتے۔ وہ تشبیہات و استعارات، حسن تعلیل، رمز و کنایہ جیسی صنعتوں کا بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن ترسیل میں ابہام پیدا نہیں ہونے دیتے۔ ان کے دل سے نکلی ہوئی بات اثر رکھتی ہے:

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

سر سے شعلے اٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جاری ہیں
شمع سے یہ کس نے ذکر اس محفل آرا کا کیا

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زُلف دراز میں
سو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

خرام ناز نے کس کے جہاں کو کر دیا برہم
زمیں گرتی فلک پر ہے فلک گرتا زمیں پر ہے

اُس لب نازک کو برگِ گل سے دینی ہے مثال

اُس قیامت قد کو شب دیکھا تھا ہم نے خواب میں
دل نے محشر کا سماں وقت سحر دکھلا دیا

مومنؔ کے کلام میں حسن و جمال کے بیان اور بے خوف وخطر عشقیہ مضامین کو پیش کرنے کے سبب یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مومنؔ کی شاعری میں معاملہ بندی کی مثالیں نمایاں طور پر موجود ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے، اس عہد میں لکھنؤ اسکول معاملہ بندی کے اشعار کے لئے مشہور تھا اور خصوصاً جرأت کی مثال دی جاتی تھی۔ مومنؔ کے کلام میں عشقیہ جذبات و احساسات کا بیان ضرور ہے، لیکن ان کے یہاں 'چوما چاٹی' نہیں ہے۔ مومنؔ کے ناقد پروفیسر ظہیر احمد صدیقی مومن کی معاملہ بندی پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جہاں تک واردات عشق کے بیان اور حسینوں سے چھیڑ چھاڑ کا تعلق ہے، مومنؔ، جرأتؔ اور داغؔ میں بعض امور میں ضرور مشترک ہیں، لیکن اتنا اشتراک مماثلت کے لئے کافی نہیں ہے۔ ہماری رائے میں جرأتؔ کی شاعری چوما چاٹی کی شاعری ہے اور داغؔ کی رندانہ بانکپن کی۔ ان کے برخلاف مومنؔ کے یہاں فکر اور جذبہ کا امتزاج ملتا ہے۔'' (مومنؔ-شخصیت اور فن از ظہیر احمد صدیقی، دہلی یونیورسٹی دہلی، ۱۹۷۲ء، ص ۲۰۴)

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی کا یہ بیان مومن سے عقیدت پر بھی منحصر ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ مومنؔ کے یہاں معاملہ بندی کی مثالیں موجود نہیں ہیں، لیکن ابتذال یا عامیانہ پن نہ کے برابر نظر آتا ہے۔ شاید اس کا سبب یہ مومنؔ کا تعلیم یافتہ ہونا ہے، وہ دہلی کے

مہذب رنگ کا بھی کسی حد تک لحاظ رکھتے ہیں۔ کچھ اشعار اس طرح کے موجود ہیں:

وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے
خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

تھی وصل میں بھی فکر جدائی تمام شب
وہ آئے تو بھی نیند نہ آئی تمام شب

پھولے جامے میں سماتے ہی نہیں
وصل شوخ چست پیراہن میں ہم

شب رہے تجھ بن زبس بے چین بے آرام ہم
صبح تک رویا کیے لے لے کے تیرا نام ہم

اوّل اُلفت ہے یارب وصل ہی میں ہو وصال
ہم کو تو جیتا نہ رکھیو آمد ہجراں تلک

اردو شاعری میں ولؔی کی طرح مومنؔ بھی ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ دونوں کا محبوب مجازی ہے، دونوں عشق کے بیان میں مہارت رکھتے ہیں۔ ولؔی اپنے سجن کی تعریف میں آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ مومنؔ بھی اپنے جذبات کے اظہار میں کوئی پردہ نہیں رکھتے۔ مومنؔ اپنے معاصرین میں موضوع، اسلوب اور شخصیت کے اعتبار سے ایک علاحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ درج ذیل غزلوں میں ان کا مخصوص رنگ دیکھا جا سکتا ہے:

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہوگئے ناچار جی سے ہم

بہر عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آواز پا کے ساتھ

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے
فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

مومنؔ کے بیشتر کلام میں یہی رنگ دکھائی دے گا۔ مومنؔ کو اپنی انفرادیت کا احساس تھا، ان کا کہنا تھا:

سن رکھو، سیکھ رکھو، اس کو غزل کہتے ہیں
مومنؔ اے اہل فن، اظہار ہنر کرتا ہے

غزل سرائی کی مومنؔ نے کیا، کہ اشک سے آج
چمن میں سینے عنادل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

مومنؔ یہ شاعروں کا مرے آگے رنگ ہے
جوں پیش آفتاب ہو، بے نور تر چراغ

پڑھتا ہے کہیں غزل جو مومنؔ
لگ اٹھتی ہے ایک بار آتش

ایسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہے سب کا سر
مومنؔ نے اس زمین کو مسجد بنادیا

مومنؔ کا کلام عشقیہ جذبات سے سرشار ہے، لیکن بقول مولوی کریم الدین انھوں نے آخر میں سب کچھ چھوڑ کر توبہ کر لی تھی، مومن خود اپنے آپ پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں:

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

بلاشبہ مومنؔ کے کلام کی قدر ان کے عہد میں ہوئی اور بعد میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

☆☆☆